ڈاکٹر رفاقت علی شاہد*

ڈاکٹر کرن اسلم*

رجب علی بیگ سروؔر کے تراجم کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

Abstract: Rajab Ali Baig Suroor owns the authorship of remarkable Urdu tale Fasana e Ajaib. He also translated three classic books in Urdu from Persian. The first of them is Suroor e Sultani, translation of Persian semi historical or historical epic, Tarikh e Shamshir Khwani, which is a summarized narrative of Persian glorious epic Shahnama. Suroor's second translation is Gulzar e Suroor, a literal translated adaptation of famous allegory: Hadaiqul Usshaq of Mulla Razi Tabrezi, and third of this series is a translation of famous Alf Laila Wa Laila into Urdu named Shabistan e Suroor. The last one is actually not a translation but an adaptation of stories and translations of Munshi Abdul Kareem of Lucknow, printed well before Rajab Ali Baig Suroor. The present article elaborates the facts about the classic culture of translation, especially translations in Urdu from Oriental languages. Moreover, Sarroor's translations have been evaluated. This article highlights some gaps in research on these books and draws some conclusions.

Keywords: Mirza Rajab Ali Baig Suroor – Suroor e Sultani – Gulzar e Suroor – Shabistan e Suroor – Urdu tales – Dr Naiyer Masud – Dr Gyan Chand – Dr Hanif Naqvi.

کلیدی الفاظ: مرزا رجب علی بیگ سرور، سرورِ سلطانی، گلزارِ سرور، شبستانِ سرور، ڈاکٹر نیّر مسعود، ڈاکٹر گیان چند، ڈاکٹر حنیف نقوی۔

سروؔر اُردو کے صاحبِ طرز نثر نگاروں میں ممتاز مقام کے حامل ہیں۔ وہ دبستانِ لکھنؤ کے پہلے صاحبِ طرز نثر نگار کہلاتے ہیں۔ اُن کا شاہ کار "فسانۂ عجائب" اُردو ادبی نثر کی لکھنوی روایت کے پہلے سنگِ میل کی حیثیت

---

*معاونِ ادبیات: بزمِ اقبال، نرسنگھ داس گارڈن، ۲-کلب روڈ، لاہور

**۱۵۰۔ اربن وِلاز، ہربنس پورہ روڈ، لاہور

رکھتا ہے۔ لکھنوی نثری اَدب کی نمائندہ خصوصیات کا جتنا بھرپور تحریری اظہار سرورؔ کے ہاں نظر آتا ہے، وہ اَوروں کے ہاں مشکل سے دکھائی دے گا۔ وہ غالبؔ کے ہم عصر، "فسانۂ عجائب" جیسے شہرۂ آفاق نثری شاہ کار کے خالق اور دبستانِ لکھنؤ کی نثر نگاری کی واضح پہچان کرانے والے نمائندے کے طور پر بھی پہچانے جاتے ہیں۔

سرور اور دبستان لکھنؤ کی نثری روایت:

شمالی ہند کی طرح اَودھ یا لکھنؤ میں بھی ادبی نثر کی ابتدائی تصانیف و تالیفات افسانوی اَدب سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس سلسلے میں اہم تر بات یہی ہے کہ لکھنوی دبستانِ نثر کی روایت کا اولین اور مضبوط ترین حوالہ قصّوں کی شکل میں سامنے آیا۔ صحیح صورتِ حال کا ادراک کرنے کے لیے دیکھا جائے یا غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ لکھنوی نثر نگاروں نے اپنی خلاّقی، فن کاری اور تخلیق کے جوہر قصّوں اور داستانوں میں زیادہ بہتر انداز میں دکھائے ہیں۔ اُردو ادب کی تاریخ میں لکھنوی دبستان کے تحت جس قدر منظوم اور منثور قصّے اور داستانیں لکھی گئیں، انھیں دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ لکھنؤ والوں کو کہانی کہنے، کہانی سننے اور کہانی لکھنے سے طبعی رغبت تھی۔ وہ کہانی سے جڑے ہوئے لوگ تھے۔ کہانی، جو ہر زبان کے ادب کا بنیادی بیانیہ ہے۔ ان کہانیوں، قصّوں اور داستانوں کے ذریعے لکھنوی فن کاروں نے کام یابی کے ساتھ اُردو کے لکھنوی دبستانِ نثر کی ایک الگ، منفرد اور بے مثال پہچان بنائی۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ دہلوی دبستان کے مقابلے میں ایک ایسے منفرد اور بار آور دبستان کی تشکیل میں کام یاب رہے جو آج بھی اردو ادب میں اپنی انفرادیت، لطافت، فن کاری، متنوع ادبی جہات اور منفرد اسلوب و اندازِ بیان سے پہچانا جاتا ہے۔

لکھنوی دبستان کا نمائندہ اور سب سے مشہور نثری قصّہ "فسانۂ عجائب" کو کہا جاتا ہے جو اگرچہ ۱۲۴۰ھ / ۱۸۲۵ء میں تصنیف ہوا لیکن سرورؔ اس میں اپنی وفات سے کچھ عرصے قبل تک ترمیم و اضافے کرتے رہے۔ "فسانۂ عجائب" خلا میں تخلیق نہیں ہوا، بل کہ اس کی تخلیق سے پہلے لکھنؤ میں قصّہ نگاری اور لکھنوی بیانیے کی ایک روایت موجود تھی جس کا نقطۂ آغاز "نو طرزِ مرصّع" تھا اور انشا اللہ خاں انشاؔ کی دو کہانیاں بھی اسی روایت کا حصّہ سمجھی جاتی ہیں، لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ "فسانۂ عجائب" کی تصنیف ۱۸۲۵ء تک لکھنؤ میں جو اہم تر نثری قصّے اور کہانیاں لکھی گئیں اور جو اپنے اُسلوب میں لکھنوی دبستان کی نمائندگی کرتے ہیں، ان کی ایک سرسری فہرست دیکھ لی جائے:(۱)

۱۔ ۱۱۹۰ھ / ۱۷۷۵ء کے قریب: "نَو طرزِ مرصّع"، از میر محمد حسین عطا خاں تحسینؔ۔

۲۔ ۱۷۸۸ء اور ۱۷۹۰ء کے مابین: "رانی کیتکی کی کہانی"، از میر انشا اللہ خاں انشاؔ۔

۳۔ ۱۲۱۱ھ / ۱۷۹۰ء: "جذبِ عشق"، از سیّد حسین شاہ حقیقؔت بریلوی۔

۴۔ ۱۲۱۴ھ تا ۱۲۲۰ھ / ۱۷۹۹ء تا ۱۸۰۵ء: "سِلکِ گوہر"، از میر انشا اللہ خاں انشاؔ۔

۵۔ ۱۲۱۷ھ / ۱۸۰۲ء: "قصّۂ چہار درویش"، از محمد غوث زرّیں۔

۶۔ ۱۲۱۸ھ / ۳-۱۸۰۲ء کے قریب: "نو آئینِ ہندی" (قصّۂ ملک محمد وگیتی افروز)، از مہر چند کھتری۔ (۲)

۷۔ ۱۲۲۰ھ / ۱۸۰۵ء: "انشائے گلشنِ نو بہار"، از شیخ محمد بخش مہجوؔر لکھنوی۔

۸۔ ۱۲۳۰ھ / ۱۸۱۵ء: "انشائے چار چمن"، از شیخ محمد بخش مہجوؔر لکھنوی۔

۹۔ ۱۲۳۰ھ / ۱۸۱۵ء: "انشائے نور تن"، از شیخ محمد بخش مہجوؔر لکھنوی۔

۱۰۔ ۱۲۳۸ھ / ۱۸۲۲ء: "ہفت سیاح"، از غلام غوث تشنؔہ۔

۱۱۔ ۱۲۴۰ھ / ۱۸۲۵ء: "فسانۂ عجائب"، از مرزا رجب علی بیگ سرورؔ۔

اس فہرست سے علم ہوتا ہے کہ "فسانۂ عجائب" کی تصنیف سے قبل لکھنوی طرزِ اُسلوب میں کم سے کم دس نثری قصّے لکھے جا چکے تھے۔ ان میں سے پہلے اور چوتھے کو چھوڑ کر بقیہ سبھی طبع زاد قصّے ہیں۔

اس کے مقابلے میں اسی دور میں دہلوی دبستان کے نثری قصوں کی روایت کو دیکھا جائے تو وہ اتنی بارآور اور مضبوط نظر نہیں آتی۔ اٹھارھویں صدی میں دلی میں درج ذیل تین قصوں کا سراغ ملتا ہے: (۳)

۱۔ ۱۷۶۰ء سے قبل : "قصّۂ مہر افروز و دلبر"، از عیسوی خاں بہادر۔

۲۔ آغاز ۱۲۰۷ھ / ۹۳-۱۷۹۲ء: "عجائب القصص"، از شاہ عالم ثانی آفتاؔب۔

۳۔ ۱۲۱۳ھ / ۱۷۹۸ء : "قصّۂ نور تن جہاں"، از نامعلوم۔ (۴)

اس کے بعد افسانوی ادب کی دہلوی دبستانِ نثر کی روایت فورٹ ولیم کالج، کلکتّے میں منتقل ہو گئی، چناں چہ ۱۸۰۱ء سے ۱۸۱۱ء تک فورٹ ولیم کالج، کلکتہ میں بیسیوں اُردو قصّے اور حکایتیں ترجمہ و تصنیف ہوئیں جو اپنے اُسلوب اور زبان میں دہلوی دبستان نثر ہی کی نمائندگی کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فورٹ ولیم کالج سے باہر اس عرصے میں دہلوی دبستان کے نمائندہ طبع زاد اور مترجم قصّوں کی تعداد بہت کم ہے۔ ان دونوں کی تفصیل ڈاکٹر گیان چند کی مشہورِ زمانہ تصنیف "اُردو کی نثری داستانیں" میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

دراصل شاہ عالم ثانی کی وفات کے بعد ۱۸۰۳ء میں دہلی پر انگریزوں کے عملاً تسلّط اور دہلی کی مغلیہ سلطنت کے قلعے تک محدود ہو جانے کی وجہ سے دہلی کے سیاسی و معاشی حالات بے حد دِگر گوں ہو چکے تھے۔ ان حالات نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی تک دہلی کی ادبی فضا کو بھی مکدّر کیے رکھا۔ اس صورتِ حال میں ہر کسی کو جان

کے لالے پڑے تھے۔ ہر کوئی جسم و روح کا رشتہ قائم رکھنے کے لیے رات دن ایک کیے تھا۔ ایسے میں قصے کہانیاں لکھنے کا کسے ہوش تھا۔ لکھنؤ میں تو اسی دور میں فارغ البالی تھی، بے فکری، امن و سکون اور بے خوف و خطر زندگی گزارنے کی سہولت میسّر تھی۔ لکھنؤ کی فضا تو قصّے کہانیاں اور داستانیں سُننے سُنانے اور لکھنے لکھانے کے لیے موزوں ترین تھی لیکن لٹی پُٹی دہلی کی خستہ حالی نے یہ نوبت ہی نہیں آنے دی کہ دہلی اس معاملے میں لکھنؤ کا مقابلہ کر سکتی، یہی وجہ ہے کہ وہاں اس نصف صدی میں کوئی غیر معمولی قصہ یا داستان نہیں لکھی گئی۔ مقابلتاً لکھنؤ میں فارغ البالی، معاشی آسانیوں اور ادبا و شعرا کی قدردانی کے باعث قصہ اور داستان گوئی و نویسی کی روایت اتنی مضبوط ہوئی کہ اس کے اثرات اردو کی نثری و منظوم داستانوں اور قصوں پر آخر تک محسوس کیے جاسکتے ہیں۔

اردو ادب کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد لکھنؤ میں قصہ داستان نویسی کی روایت مضبوط تر ہوئی لیکن دہلی میں یہ روایت اتنی مضبوط تب بھی نہیں ہو سکی۔ دہلی میں لے دے کے "بوستانِ خیال" کا پہلا مطبوعہ ترجمہ خاصے کی چیز ہے جو خواجہ بدر الدین امان اور خواجہ قمر الدین راقم کا کیا ہوا ہے یا فخر الدین حسین خان کا قصہ "سروشِ سخن" اور چند دیگر غیر معروف قصے دہلی میں قدیم افسانوی ادب یاد دلاتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں لکھنؤ میں بے شمار مختصر و طویل قصوں کے ساتھ ساتھ "داستانِ امیر حمزہ" کا ۴۶ جلدوں پر مشتمل طویل مطبوعہ سلسلہ بھی وجود میں آیا۔ یاد رہے کہ ان مطبوعہ ۴۶ جلدوں کے علاوہ "داستانِ امیر حمزہ" کے اور دیگر داستانوں کے سلسلے کی بیسیوں جلدیں مطبع منشی نول کشور کے محافظ خانے میں ۱۹۶۰ء تک موجود تھیں[۵] جو شائع نہیں ہو سکیں اور اب غالباً ضائع ہو چکی ہیں۔ یوں دیکھا جائے تو صرف منشی نول کشور کے ہاں "داستانِ امیر حمزہ" سمیت مختلف داستانوں کی کم و بیش ایک صد جلدیں بلکہ ضخیم جلدیں تحریر ہوئیں۔ ان میں سے نصف کے قریب ضخیم جلدیں اسی مطبعے سے طبع و شائع بھی ہوئیں۔ علاوہ ازیں رام پور میں "داستانِ امیر حمزہ" اور "بوستانِ خیال" سمیت مختلف داستانوں کی بیسیوں ضخیم جلدوں اور نثری قصوں کے مخطوطات موجود ہیں۔[۶] ان سب کا تعلق بھی لکھنوی دبستان سے ہے، کیوں کہ ان کے لکھنے والے بیش تر لکھنوی مصنفین تھے یا ان لکھنوی مصنفین کی اولادوں اور شاگردوں میں سے تھے۔ اس کے علاوہ "طلسمِ حیرت" "فسانۂ دل فریب" "جادۂ تسخیر" "طلسمِ فصاحت" "فسانۂ معقول"، وغیرہ ہم سمیت ایسے بیسیوں دل چسپ قصے لکھنؤ میں لکھے گئے جو آج بھی اردو قصہ گوئی کے ذخیرے میں اپنی شان دکھا رہے ہیں۔ ان سب کی تفصیل گیان چند کی کتاب "اردو کی نثری داستانیں" میں دیکھی جاسکتی ہے۔

جیسا کہ اوپر تفصیل سے بیان کیا گیا کہ "فسانۂ عجائب" طبع زاد قصّہ ہے اور اس سے قبل لکھے جانے والے بیش تر لکھنوی قصّے طبع زاد ہی تھے لیکن "فسانۂ عجائب" کی تصنیف ۱۲۴۰ھ مطابق ۱۸۲۵ء کے دس سال بعد،

تیرھویں صدی ہجری کے وسط سے لکھنؤ میں قصّوں، کہانیوں، حکایات، وغیرہ کے تراجم تسلسل کے ساتھ منظرِ عام پر آنا شروع ہو گئے تھے، چناں چہ رجب علی بیگ سرور کے پہلے ترجمے "سرورِ سلطانی" تک درج ذیل قصے اردو میں ترجمہ ہو کر لکھنوی دبستان کی شان کو بڑھانے کا سبب بن چکے تھے (۷):

۱۔ ۱۸۳۶ء: "قصّۂ گل و صنوبر" (فارسی سے ترجمہ)، از نیم چند کھتری۔

۲۔ ۱۲۵۱ھ / ۱۸۳۶ء: "بستانِ حکمت" (ترجمۂ "انوارِ سُہیلی")، از فقیر محمد خاں گویا ملیح آبادی۔

۳۔ ۱۲۵۷ھ / ۳۔ ۱۸۴۲ء: "الف لیلہ" (انگریزی سے ترجمہ)، از منشی عبدالکریم لکھنوی۔

۴۔ قبل ۱۲۶۱ھ / ۱۸۴۵ء: "قصۂ بہرام گور"، (فارسی سے ترجمہ)، از میر فرخندہ علی نوتینوی۔

۵۔ ۱۲۶۲ھ / ۱۸۴۵ء: "حکایاتِ سخن سنج" (طوطا کہانی")، از انبا پرشاد رسا لکھنوی۔

۶۔ قبل ۱۲۶۳ھ / ۱۸۴۷ء: "قصۂ اگر گل"، (فارسی سے ترجمہ)، از سعادت خاں ناصر لکھنوی۔

۷۔ ۱۲۶۳ھ / ۱۸۴۷ء کے قریب: "الف لیلہ" (۱۰ جلدیں)، (عربی سے ترجمہ)، از حیدر علی فیض آبادی۔

۸۔ ۱۲۶۳ھ / ۱۸۴۷ء: "عجیب و غریب"، (فارسی سے ترجمہ)، از میر سید ولایت علی بریلوی۔

۹۔ ۱۲۶۴ھ / ۸۔۱۸۴۷ء: "سرورِ سلطانی" (ترجمۂ "شمشیر خانی")، از رجب علی بیگ سرور۔

اس فہرست پر غور کرنے سے دو اہم امور سامنے آتے ہیں۔ پہلا یہ کہ ان تراجم میں سے "الف لیلہ" کو چھوڑ کر، جو عربی الاصل ہے، باقی تمام تراجم فارسی سے اُردو میں ہوئے، اور دوسرا یہ کہ ان تراجم میں سے آخری کتاب سرور کا پہلا ترجمہ ہے، گویا سرور جب ترجمہ نگاری کی جانب متوجّہ ہوئے تو لکھنؤ میں افسانوی ترجمہ نگاری کی روایت خاصی مستحکم ہو چکی تھی۔ اس سے ایک تیسری بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اس وقت تک، یعنی "سرورِ سلطانی" کے ترجمے (۱۲۶۴ھ / ۸۔۱۸۴۷ء) تک، لکھنوی اُسلوبِ بیان کی افسانوی روایت بھی ستّر اسّی سال کی بہاریں دیکھ کر پختہ تر ہو چکی تھی۔

مذکورہ دونوں فہرستوں کے ملاحظہ کرنے سے چوتھی بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ سرور کے عہد تک دبستانِ لکھنؤ کے افسانوی ادب میں ترجموں کی تعداد نسبتاً کم اور تصنیفات کی تعداد زیادہ تھی لیکن "فسانۂ عجائب" کے بعد یہ رجحان معکوس ہو گیا اور کثرت سے فارسی قصوں کے اردو تراجم سامنے آنے لگے۔ یہ اظہر من الشمس ہے کہ ترجمے میں ترجمہ نگار کو کھل کھیلنے کا موقع نہیں مل سکتا، اس کے باوجود ان تراجم میں لکھنوی طرزِ بیان، اسلوب اور معاشرت کی جھلکیاں کسی طرح بھی پہلے دور کی تصانیف کے مقابلے میں کم نظر نہیں آتیں۔ زیادہ بہتر طور پر یوں کہا جا سکتا ہے کہ ترجمے کی نسبت تصنیف میں انفرادی رنگ قائم رکھنا آسان ہوتا ہے لیکن مندرجۂ بالا تراجم اپنے

منفرد لکھنوی رنگ کی نمائش میں کسی طرح بھی تصنیفات سے کم نہیں دکھائی دیتے۔ یہ رجحان بتاتا ہے کہ لکھنوی ادیبوں اور تخلیق کاروں کے پیشِ نظر لکھنوی دبستان کی انفرادیت اور لکھنوی تہذیب کو نمایاں کرنا تھا۔ اس کی نسبت قصے میں کہانی، واقعات اور دل چسپی کا خیال رکھنا ان کے نزدیک زیادہ اہم نہیں تھا۔ ویسے بھی قصوں اور تمثیل کی تکنیک میں پلاٹ، کردار اور مکالمے زیادہ اہم نہیں گردانے جاتے۔

قدیم دور میں ترجمہ نگاری کے رجحانات:

ترجمہ نگاری کے جدید رجحان میں عام طور پر بدیسی یا غیر زبان کے متن کو بعینہٖ اُردو میں منتقل کرنے پر زور دیا جاتا ہے۔ سرور کے عہد میں، بل کہ انیسویں صدی میں عمومی طور پر ترجمہ نگاری کا یہ رجحان نہیں تھا، اس کی بجائے آزاد ترجمے اور تخلیقی ترجمے کو ترجیح دی جاتی تھی۔ اس دور میں ترجمے کی ثقافت یہ تھی کہ اپنے ماحول اور تمدّن سے ہم آہنگ بدیسی متون کو اُردو میں یوں ڈھالا جائے کہ ترجمہ اُردو کی ادبی ثقافت اور معاصر معاشرتی اقدار میں یک جان ہو کر تخلیقی شان کو منعکس کرے۔

اس طرزِ عمل کا بدیہی نتیجہ یہ تھا کہ قدیم دور میں، یعنی انیسویں صدی عیسوی تک، ترجمے کے لیے عموماً اُنھی بدیسی یا مقامی متون کا انتخاب کیا جاتا تھا جن کا متن ہندوستانی تہذیب اور اردو کی ثقافت سے مطابقت رکھتا تھا۔ قدیم ادبی تراجم کے دیباچوں، وغیرہ میں مترجمین کے بیانات سے اس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ رجحانِ عام اور روایتی ضروریات کو بھی مدِّنظر رکھا جاتا تھا۔ اُس دور کا عمومی معاشرتی رویہ ادب دوست تھا۔ اَودھ اور خاص طور پر لکھنؤ میں تو فارسی اور اُردو کا ادبی ذوق عوامی سطح تک موجود اور مقبول تھا، نتیجتاً لکھنوی معاشرے کا عمومی رجحان اس وقت کے دیگر ہندوستانی معاشروں کی نسبت اَدبی اور ثقافتی روایات کا زیادہ حامل تھا۔ ایسے میں عام ضرورت اور مقبولیت کے نقطۂ نظر سے بھی جو متن ترجمے کے لیے منتخب کیا جاتا تھا، اُس کی اور اس کے اُردو ترجمے کی اَدبی حیثیت مسلم ہوتی تھی۔

اُنیّسویں صدی عیسوی کے اختتام تک ہندوستانی ادبیات میں فارسی اور عربی زبانوں کو مقتدرہ کی حیثیت حاصل رہی۔ سرور کے عہد تک تو فارسی ہنوز سرکاری اور ادبی اشرافیہ کی زبان کے مرتبے پر فائز تھی۔ انھی وجوہ سے عربی اور خصوصاً فارسی متون کو تقدّم اور استناد کا درجہ حاصل تھا، لہٰذا اُنیّسویں صدی کی اختتام تک اُردو کے افسانوی اَدب میں عام طور پر انھی دونوں زبانوں (خاص کر فارسی زبان) سے بے شمار تراجم کیے گئے۔ اُردو میں ترجمہ شدہ زیادہ تر قصّے، کہانیاں، حکایات، وغیرہ انھی زبانوں سے اُردو میں منتقل کی گئیں۔ اوپر لکھنوی روایت کے جن افسانوی

تراجم کی فہرست دی گئی، اسے دیکھنے سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان میں "الف لیلہ" کا ترجمہ عربی سے اور باقی سب قصوں کے ترجمے فارسی سے اردو میں کیے گئے ہیں۔

قدیم دور کی ثقافت اور افسانوی تراجم کی روایت کا بغور جائزہ لیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس دور میں وہ افسانوی تراجم زیادہ مقبول ہوئے جو فارسی سے اُردو میں کیے گئے۔ سرکاری اور اَدبی اشرافیہ کی زبان ہونے کی وجہ سے عوامی سطح پر فارسی کے بارے میں یہ تاثر گہرا ہو چکا تھا کہ اعلیٰ مضامین اور اُسلوبِ بیان کے گونا گوں رنگ جس مقدار، معیار اور خوبی کے ساتھ فارسی میں برتے گئے ہیں اور برتے جاسکتے ہیں، وہ کسی اَور زبان میں ممکن نہیں۔ اس لیے فارسی سے ترجمہ کی گئی کتابیں ہاتھوں ہاتھ لی جاتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ ناشر عام طور پر کتاب کے سرورق پر یہ خاص طور پر درج کراتے تھے کہ یہ کتاب فارسی سے ترجمہ کی گئی ہے۔ اس کی سب سے عمدہ مثال "داستانِ امیر حمزہ" کا وہ کثیر جلدی سلسلہ ہے جو منشی نول کشور لکھنؤ کے ہاں تخلیق ہوا۔ اس ادارے سے "داستانِ امیر حمزہ" کے سلسلے کی ۴۶ جلدیں شائع ہوئیں، ان میں سے مختلف جلدوں کے سر اوراق پر اور دیباچوں میں انھیں التزاماً فارسی سے ترجمہ شدہ تحریر کیا گیا ہے۔ (۸) ظاہر ہے کہ ایسا اس لیے کیا گیا کہ اُس وقت فارسی ہی کو اعلا ادبی زبان کے طور پر قبول کیا جاتا تھا، جب کہ اُردو میں طبع زاد تحریروں کو فارسی تراجم کے مقابلے میں زیادہ اہمیّت نہیں دی جاتی تھی۔

سرور، غالب کے معاصر تھے۔ غالب ہی کی طرح انیسویں صدی کے اوائل میں جب وہ طلبِ علم و ادب کے مراحل طے کر رہے تھے تو اس وقت فارسی ادبی زبان اور عربی مذہبی زبان کے طور پر اپنی حاکمیت کے مقام پر موجود تھیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی فتوحات کے باعث یورپی اقوام کے اثر و نفوذ اور ان کی سیاسی پالیسیوں کی وجہ سے آہستہ آہستہ سرکاری اور عوامی سطح پر عربی و فارسی کا چلن کم ہوتا گیا۔ اس کی جگہ اُردو کو سرکاری سرپرستی حاصل ہوئی تو معاشرتی سطح پر بھی اُردو زبان و ادب کو زیادہ اہمیت ملنے لگی، چناں چہ ادبی اور عوامی سطح پر فارسی اور عربی کا ذوق ختم تو نہیں ہوا، البتہ پہلے کی نسبت کچھ کم ضرور ہو گیا اور یہ ضرورت محسوس کی جانے لگی کہ اب فارسی اور عربی کے اعلا اور اہم متون کو اُردو میں منتقل کیا جانا چاہیے، بل کہ انگریزوں کے اثر کی وجہ سے انگریزی کے بعض متون بھی اُنیسویں صدی میں اردو میں منتقل کیے گئے۔

یہاں اسی حوالے سے ایک اَور معاملے کی جانب توجہ دلانا بھی ضروری ہے جسے عام طور پر درخورِ اعتنا نہیں جانا جاتا۔ اُنّیسویں صدی عیسوی کے آخر تک، بل کہ بیسویں صدی عیسوی کے ابتدائی عشروں تک کی زیادہ تر تصانیف و تالیفات اور تراجم، ان کے مصنّفین، مولّفین اور مترجمین کے بقول، فرمائشی ہوتے تھے۔ تصنیف و تالیف کی کوئی منصوبہ بند روایت موجود نہیں تھی، بل کہ دوستوں، عزیزوں، سرپرستوں، امرا، بادشاہوں، وغیرہ کی

فرمائش پر کتابیں تصنیف یا ترجمہ ہوتی تھیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ان تراجم میں مترجم کی اپنی منشا اور مرضی بھی شامل ہوتی تھی لیکن انکسار کی وجہ سے تقریباً تمام مترجمین نے اپنے ترجموں کی تخلیق کا سہرا اپنے جاننے والوں کے سر ہی باندھا ہے۔

یہی سرور کی معاصر اَدبی فضا تھی جس میں وہ اپنے تراجم تالیف کر رہے تھے۔ اسی اَدبی ماحول اور بدلتے علمی رجحانات میں رہ کر انھوں نے اپنی انفرادیت دکھائی اور منوائی بھی؛ نہ صرف اپنا منفرد مقام بنایا، بل کہ شہرتِ عام کے ساتھ بقاے دوام کو بھی اپنے نام کرنے کا کارنامہ انجام دیا۔ سرور کے تراجم کا مطالعہ کرتے ہوئے اس اَدبی ماحول یا پس منظر کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔

سرور کے تراجم کا تعارف اور نوعیت:

مرزا رجب علی بیگ سرور کی تصانیف و تالیفات میں تین تراجم ملتے ہیں۔ سرور کے اپنے بیان کے مطابق ان میں سے دو تراجم انھوں نے براہِ راست فارسی سے کیے، جب کہ ایک ترجمہ عربی کیا۔ ڈاکٹر نیّر مسعود نے انھیں "مترجم تالیفیں" قرار دیا ہے اور بالکل درست لکھا ہے۔ ذیل میں ان تراجم کا مختصر تعارف اور ان کی نوعیت واضح کرنے کے ساتھ ساتھ ان سے متعلق بعض تحقیقی مباحث کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے:

۱۔ "سُرورِ سلطانی":

سرور کا یہ پہلا ترجمہ ہے جو ۱۲۶۴ھ (مطابق ۱۸۴۸ء) میں مکمل ہوا۔ اس کے بارے میں خود سرور کا بیان یہ ہے:

> "سلطانِ عالم محمد واجد علی شاہ خلد اللہ ملکہ ۔۔۔ زیبِ سریرِ سلطنت ہوا، جلوس فرمایا۔۔۔ ۱۲۶۳ھ ۔۔۔۔ اس تاریخ کو قطب الدولہ مفتاح الملک، مونس و دل پذیر محمد قطب علی خاں بہادر مستقیم جنگ مصاحبِ خاص حضرت سلطانِ عالم خلد اللہ ملکہ نے پیش کش کیا۔۔۔ جس دم قبلۂ عالم و عالمیان۔۔۔ نے ملاحظہ فرمایا۔۔۔ ملازموں کے زمرے میں آبرو بخشی۔۔۔ بعد چندے کہ سن ہجری بارہ سے چونسٹھ [۱۲۶۴ھ / ۱۸۴۷-۴۸ء] تھے، حکم قضا شیم صادر ہوا کہ "شمشیر خانی" زبانِ اُردو میں لکھ۔۔۔ فیضِ ارشادِ ہدایت بنیادِ سلطانِ عالم جس دم تمام یہ ترجمۂ "شمشیر خانی" ہوا، نام اس کا "سرورِ سلطانی" ہوا۔ (۹)

کتاب کے اختتام پر وہ اس کے ترجمے کا دورانیہ دو ماہ تحریر کرتے ہیں:

"الحمد اللہ! شکر کی جا ہے کہ حسبِ ارشادِ ہدایت بنیادِ سلطانِ باوقار، شاہنشاہِ شب زندہ دار، دو مہینے کے عرصے میں یہ نسخہ طیّار ہوا۔"(۱۰)

سرور نے اگرچہ اسے ترجمہ کہاہے لیکن سب تالیف میں آگے جاکر خود ہی یہ بھی لکھ دیا کہ:

"فیض ارشادِ ہدایت بنیادِ سلطانِ عالم حامی و مددگار ہوا، یہ نسخہ طیّار ہوا۔ رنگینی اور نثّاری سے یہ نثر اور فقیر عاری ہے، خلاصہ مضمون اور مطلب نگاری ہے۔ جو کچھ فردوسیِ سخن دان نے نظم کیا ہے، وہی مضمونِ "شمشیر خانی" ہے، لیکن اِس تحریرِ حال میں مقدّمۂ ثانی ہے، کہ حسب و نسبِ شاہانِ نام دار میں تحقیق کی طرف طبیعت متوجہ نہیں ہوئی۔ فقط شاعری [یعنی تالیف نگاری یا اُسلوب بیان وقصّہ] کی طاقت سے مرقع بنایا، ہر مصرعِ تصویر تحریر کر کے دکھایا۔ لہٰذا کتبِ تواریخ معتبر سے، کہ ان کا نام موقع اور مقام پر آجائے گا، دیکھ کے لکھا کہ ناظرین کے نزدیک اس کا عزّ و وقار ہو، شک باقی نہ رہے، نسخہ ذی اعتبار ہو۔"(۱۱)

سرور کے ان بیانات سے علم ہوا کہ سرور نے یہ ترجمہ ۱۲۶۴ھ (۱۸۴۸ء) میں نواب واجد علی شاہ کی فرمائش پر محض دوماہ میں مکمل کیا۔ مزید یہ کہ اُنھوں نے محض "شمشیر خانی" کے ترجمے سے کام نہیں رکھا، بل کہ اصل متن پر تحقیق مزید کی اور اس کی مدد سے فارسی متن پر اضافے بھی کیے۔ بات یہیں ختم نہیں ہوتی، "سرورِ سلطانی" کئی خصوصیات کی حامل ہے۔ اس حوالے سے مزید بحث کے بجائے ان نتائج کا خلاصہ درج کرنا زیادہ مناسب ہے جو ڈاکٹر نیّر مسعود نے "سرورِ سلطانی" کے بارے میں اپنے مشاہدات اور تحقیق سے اخذ کیے ہیں:(۱۲)

ا) سرور نے ترجمے کے بجائے "سرورِ سلطانی" کو تاریخی تالیف بنانے کی کوشش کی، چناں چہ "تاریخ شمشیر خانی" کے علاوہ بیسیوں تواریخ اور خود "شاہ نامہ" کی مدد سے اُنھوں نے اسے تالیف بنادیا ہے۔

ب) سرور نے "شمشیر خانی" کے بعض بیانات یا عبارتوں کی تلخیص کر دی ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ دیگر تاریخوں اور تحقیق سے اضافوں کے باعث ترجمہ اصل کے مقابلے میں ضخیم ہوتا لیکن چوں کہ صاحبِ فرمائش (شاہِ اُودھ واجد علی شاہ) کا "حکم صادر ہوا کہ "شمشیر خانی" زبانِ اُردو میں لکھ لیکن طُول نہ ہوتا قاری و سامع ملول نہ ہو"، اس لیے اضافوں کے ساتھ ساتھ اختصار بھی سرور کے پیشِ نظر رہا۔

ج) سرور نے تلخیص و اختصار کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں اصل عبارت کو پھیلا کر یا اضافوں کے ساتھ بھی لکھا ہے۔ ایسا عموماً تہذیبی مرقّعوں کی تفصیل بیان کرتے ہوئے کیا ہے۔ گویا جہاں انھوں نے ضرورت محسوس کی، اطناب سے کام لیا اور جہاں مناسب جانا، اختصار کو پیشِ نظر رکھا۔

د) سرور نے اصل کتاب "شمشیر خانی" کے بیانات یا عبارتوں میں تحریفیں بھی کی ہیں۔ یہ تحریفیں تاریخی حوالوں کے اضافوں کے علاوہ ہیں۔ یہ تحریفیں، واقعات، ناموں اور عنوانات میں کی گئی ہیں۔

ہ) توکّل بیگ کی "تاریخِ شمشیر خانی" میں عبارتیں سادہ زبان میں ہیں، جب کہ اس کا ترجمہ (زیادہ بہتر لفظوں میں تالیف) کرتے ہوئے سرور نے اپنا روایتی رنگین اور شگفتہ اُسلوب اختیار کیا ہے۔

و) توکل بیگ نے "شمشیر خانی" میں "بے کیفی کی حد تک سیدھی اور سپاٹ عبارت لکھی ہے. "حزنیہ والمیہ مقامات پر بھی اس کے انداز و اسلوب میں کوئی فرق نہیں آتا۔" اس کے مقابلے میں "سرور ہر واقعے کو ذاتی تاثر کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور عبارت میں ایسی جان پیدا کرتے ہیں کہ ان کا ترجمہ طبع زاد تحریر معلوم ہونے لگتا ہے۔"

مذکورۂ بالا خصوصیات کی تفصیل سے واضح ہوتا ہے کہ سرور نے "تاریخِ شمشیر خانی" کے محض ترجمے سے کام نہیں رکھا، بل کہ اس میں وسیع پیمانے پر ترامیم و اضافے بھی کیے ہیں۔ اس عمل نے "سرورِ سلطانی" کو سادہ ترجمے سے زیادہ تالیف یا تخلیقی ترجمے کی شکل دے دی ہے۔

"سرورِ سلطانی" کی تالیف رجب علی بیگ سرور نے ۱۲۶۴ھ (۱۸۴۸ء) میں مکمل کی۔ یہ کتاب تالیف کے کچھ عرصے بعد شائع ہو گئی تھی۔ "سرور سلطانی" کی پہلی اشاعت اور کل اشاعتوں کے سلسلے میں مختلف مآخذ میں مختلف بیانات ملتے ہیں۔ رجب علی بیگ سرور پر سب سے اہم تصنیف ڈاکٹر نیّر مسعود کا ڈاکٹریٹ کا تحقیقی مقالہ ہے جو کتابی صورت میں ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا۔ اس میں ڈاکٹر نیّر مسعود نے تفصیل کے ساتھ "سرورِ سلطانی" سے متعلق مختلف مباحث کا احاطہ کیا ہے اور تحقیق سے بھی خوب کام لیا ہے۔ اس طرح کا مفید مطالعہ کسی اَور جگہ دیکھنے میں نہیں آیا۔ انھوں نے اپنی کتاب میں "سرورِ سلطانی" کی درجِ ذیل تین اشاعتوں کا ذکر کیا ہے:[۱۳]

۱) مطبعِ سلطانی، لکھنؤ، سنہ ندارد۔ ڈاکٹر نیّر مسعود نے اسے کتاب کی پہلی اشاعت قرار دیا ہے۔

۲) مطبعِ مسیحائی، لکھنؤ،۱۲۶۸اء۔ ڈاکٹر نیر مسعود نے اسے کتاب کی دوسری اشاعت قرار دیا ہے۔

۳) مطبعِ نامی، لکھنؤ، ۱۳۰۵ھ مطابق ۱۸۸۷ء۔

ڈاکٹر سہیل بخاری نے بھی "سرورِ سلطانی" کی تین اشاعتوں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے دو تو وہی ہیں جنھیں ڈاکٹر نیّر مسعود کتاب کی پہلی اور دوسری اشاعت قرار دے چکے تھے، یعنی مطبعِ سلطانی اور ۱۲۶۸ھ کی مطبعِ مسیحائی کی اشاعتیں۔ اس کے ساتھ انھوں نے مطبعِ خاقانی، لکھنؤ کی ایک اشاعت کا ذکر بھی کیا ہے اور اسے کتاب کی اشاعتِ اول قرار دیا ہے۔ انھوں نے اس اشاعت کا نسخہ بہ چشمِ خود دیکھنے کا دعویٰ کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

"۔۔۔یہ ترجمہ۔۔۔پہلی بار ۱۲۶۵ھ میں مطبعِ خاقانی لکھنؤ میں چھاپا گیا۔۔۔ہماری نظر سے ایک دوسرا نسخہ مطبعِ سلطانی کا مطبوعہ بھی گزرا ہے۔۔۔ان کے علاوہ سبحان اللہ اورینٹل لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں بھی ایک نسخے کا پتہ چلا ہے جو ۱۲۶۸ھ میں مطبعِ مسیحائی سے چھپا ہے۔"(۱۴)

گویا ڈاکٹر سہیل بخاری مطبعِ خاقانی، لکھنؤ کے نسخے کو کتاب کی پہلی اشاعت اور مطبعِ سلطانی، لکھنؤ کے نسخے کو کتاب کی دوسری یا بعد کی اشاعت قرار دیتے ہیں۔

ڈاکٹر آغا سہیل نے مجلسِ ترقّیِ ادب، لاہور کے لیے "سرورِ سلطانی" مرتب کی تھی جو اس ادارے سے اکتوبر ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی۔ اس کے مقدمے میں انھوں نے بھی اس کتاب کی انھی تین اشاعتوں کا ذکر کیا ہے جن کا تذکرہ ڈاکٹر نیّر مسعود نے کیا ہے، البتّہ انھوں نے مطبعِ نامی، لکھنؤ کے ایڈیشن کا سال اشاعت ۱۸۵۱ء تحریر کیا ہے جو محلِّ نظر ہے۔(۱۵)

میں نے اوپر "سرورِ سلطانی" کی اشاعتی تفاصیل کے حوالے سے تین اہم ترین قابلِ ذکر مآخذ کے حوالے نقل کیے ہیں۔ ان میں سے کسی ماخذ میں "سرورِ سلطانی" کی تین (۳) سے زیادہ اشاعتوں کا ذکر نہیں اور تینوں مآخذ میں کل چار (۴) اشاعتوں کا ذکر ملتا ہے، یعنی مطبعِ خاقانی لکھنو ۱۲۶۵ھ، مطبعِ سلطانی لکھنؤ، مطبعِ مسیحائی لکھنو ۱۲۶۸ھ اور مطبعِ نامی لکھنؤ ۱۸۸۷ء۔ ان میں ڈاکٹر آغا سہیل کے مرتّبہ متن کی اشاعت کو شامل کر لیا جائے تو "سرورِ سلطانی" کی معلوم اشاعتوں کی تعداد پانچ (۵) ہو جاتی ہے۔ ان اشاعتوں کے علاوہ مجھے "سرورِ سلطانی" کی کم سے کم دو (۲) ایسی قدیم اشاعتوں کا علم ہوا ہے جن کا تذکرہ ان مآخذ میں نہیں ہوا۔ یوں مجھے اب تک "سرورِ سلطانی" کی کل سات (۷) اشاعتوں کے بارے میں معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مختصر کوائف ذیل میں درج کر دیے جائیں:

۱) مطبوعہ "در بیت السلطنۃ لکھنؤ بمطبعۂ خاقانی"، "ہفتم رجب سنہ ۱۲۶۵ ہجری، باہتمام نمک خوار قدیم محمد حسین طبع کردید"۔ صفحات ۳۱۲، اختتام متن: صفحہ ۳۰۰، 'فرہنگ': صفحات ۳۰۱ تا ۳۱۲۔

"سرورِ سلطانی" ۱۲۶۴ھ میں تصنیف ہوئی۔ اس کے بعد یہ پہلی اشاعت ہے جس پر سنہ اشاعت درج ہے۔ یہ تصنیف سے اگلے سال کی اشاعت ہے، اس لیے قرائن سے یہی کتاب کی پہلی اشاعت لگتی ہے۔ اس کے علاوہ دو قدیم ترین اشاعتیں اَور بھی ہیں لیکن ان پر سنہ اشاعت درج نہیں، اس لیے ان کے

بارے میں یقین کے ساتھ کہنا مشکل ہے کہ ان میں سے کوئی اشاعت اوّل ہو گی اور پیشِ نظر اشاعت بعد کی۔

۲) مطبوعہ "در بیت السلطنۃ لکھنؤ بہ مطبعِ سلطانی بجاں فشانی و عرق ریزی محمد حسین منطبع شد"۔ سنہ ندارد۔ صفحات ۳۱۲، اختتام متن: صفحہ ۳۰۰، 'فرہنگ': صفحات ۳۰۱ تا ۳۱۲۔

۳) مطبوعہ مطبعِ محمدی، "حاجی حرمین شریفین مولوی محمد حسین نے مطبعِ محمدی میں چھاپی"۔ سنہ ندارد۔ صفحات ۳۱۲، اختتام متن: صفحہ ۳۰۰، 'فرہنگ': صفحات ۳۰۱ تا ۳۱۲۔

۴) مطبوعہ "در مطبعِ مسیحائی مسیح الزماں طبع نمود"، "در سنہ ۱۲۶۸ ہجری"۔ صفحات زائد از ۲۰۰، اختتام متن: صفحہ ۱۹۶، 'فرہنگ': صفحات ۱۹۷ تا آخر۔

۵) "در مطبعِ نظامی واقع کان پور مطبوع گردیدہ". ربیع الآخر ۱۲۸۴ھ۔ صفحات ۲۰۶، اختتام متن: صفحہ ۱۹۹، 'فرہنگ': صفحات ۲۰۰ تا ۲۰۶۔

۶) "باہتمام احقر الانام ابوالحسنات قطب الدین احمد صدر اللہ، بماہ ربیع الاول سنہ ۱۳۱۵ ہجری مطابق ماہ نومبر سنہ ۱۸۸۷ء، بار اول، در مطبعِ نامی، لکھنؤ رونق طبع یافت"، صفحات ۲۰۴، اختتام متن: صفحہ ۱۹۶، 'فرہنگ': صفحات ۱۹۷ تا ۲۰۴۔

۷) مرتّبہ آغا سہیل۔ مجلسِ ترقّیِ اَدب، لاہور، اشاعتِ اوّل، اکتوبر ۱۹۷۵ء۔ صفحات ۳۱۲، اختتام متن: صفحہ ۳۰۰، 'فرہنگ': صفحات ۳۰۱ تا ۳۱۲۔

ب۔ "گل زارِ سرور":

رجب علی بیگ سرور کا دوسرا ترجمہ "گل زارِ سرور" ہے۔ یہ ملّا رضی تبریزی بن محمد شفیع کی رمزیہ تصنیف یا تمثیل "حدائق العشّاق" کا ترجمہ ہے۔ یہ کتاب سرور کے زمانۂ قیامِ بنارس کی یادگار ہے۔ یہ ترجمہ اُنھوں نے والیِ بنارس مہاراجا ایشری پرشاد نرائن سنگھ بہادر کی فرمائش پر کیا۔ کتاب کا زمانۂ تالیف واضح نہیں۔ ڈاکٹر حنیف نقوی کے مطابق سرور ۶/ ذی الحجہ ۱۲۷۵ھ مطابق ۸/ جولائی ۱۸۵۹ء کو بنارس پہنچے۔ بنارس پہنچنے کے چار دن بعد اپنے مستقر رام نگر میں منتقل ہوئے اور اگلے روز یعنی ۱۲/ ذی الحجہ ۱۲۷۶ھ مطابق ۱۳/ جولائی ۱۸۵۹ء کو مہاراجا ایشری پرشاد نرائن سنگھ کی خدمت میں باریاب کیے گئے۔[۱۶] ڈاکٹر گیان چند نے اندازہ لگایا ہے کہ سرور نے بنارس پہنچنے کے بعد "گل زارِ سرور" تالیف کی، جب کہ "شبستانِ سرور" (تالیف ۱۲۷۹ھ مطابق ۱۸۶۲ء) کے دیباچے میں

اُنھوں نے "گل زارِ سرور" کی تکمیل کا ذکر کیا ہے، گویا "گل زارِ سرور" کی تالیف کا زمانہ ذی الحجہ ۱۲۷۵ھ تا ۱۲۷۹ھ کا ہے۔[۱۷]

ڈاکٹر نیّر مسعود نے وضاحت کی ہے کہ "گل زارِ سرور" کے ترجمے کے وقت "اودھ کی شاہی کے خاتمے، لکھنؤ کی بربادی، بڑھاپے، بیماریوں اور زندگی کی کش مکش نے سرور کو تھکا دیا تھا اور ان کا دل بجھ سا گیا تھا۔ کتاب کی ابتدا میں سرور نے اپنا جو مختصر حال لکھا ہے، اس کے عنوان ہی سے ان کی پژمردگی کا اعلان ہو جاتا ہے... غرض "گل زارِ سرور" ان کی مایوسی، غریب الوطنی اور پژمردگی کے زمانے کی یادگار ہے۔"[۱۸]

کتاب کی تالیف کے حوالے سے سرور کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ "ایک روز حسبِ اتفاق نسخۂ "حدائق العشاق" نظر...... سے گزرا۔ اس کے ترجمہ کرنے کو فقیر سے ارشاد فرمایا۔"[۱۹]

انھوں نے کتاب میں اپنے دیباجے کے آخر میں یہ بھی تحریر کیا ہے کہ "گو مزے اور کیفیت سے یہ نثر عاری ہے، فقط تحریرِ فرماں برداری ہے۔"[۲۰] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیباچہ کتاب کی تالیف کے بعد، یعنی آخر میں تحریر ہوا ہے۔ چوں کہ اس میں کتاب کی نثر کے بارے میں عاجزی کا اظہار کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا اظہار یا دعا کتاب شروع ہونے سے قبل نہیں کیا جاسکتا، بل کہ کتاب مکمل ہونے کے بعد ہی کیا جاسکتا ہے۔

یہ کتاب پہلی بار مطبع افضل المطابع لکھنؤ سے طبع و شائع ہوئی۔ اس کے طابع و ناشر رجب علی بیگ سرور کی کتابوں کے مستقل اور قانونی ناشر محمد یعقوب انصاری فرنگی محلی تھے۔ اس پر سنہ طباعت درج نہیں۔ اس کے خاتمۃ الطبع میں سرور کا مذکور ایسے کیا گیا ہے کہ جیسے ابھی وہ زندہ ہوں۔ اس سے اندازہ ہوتا کہ یہ اشاعت حینِ حیاتِ مصنّف ہوئی، یعنی وفات سرور (ذی الحجہ ۱۲۸۵ھ مطابق مارچ اپریل ۱۸۶۹ء) سے قبل۔[۲۱] اس پہلی اشاعت کے نسخے کی کل ضخامت ۱۰۴ صفحات ہے۔ کتاب کے شروع میں بیرونی سرورق کے اندرونی صفحے پر مرزا غالب کی تقریظ ہے۔ بعد ازاں اندرونی سرورق کے بعد صفحہ ۲ سے دیباچہ مصنّف شروع ہوتا ہے جو صفحہ ۸ کے وسط میں ختم ہوتا ہے۔ یہیں سے کتاب یا تمثیل کے متن کا آغاز ہوتا ہے۔ صفحہ ۱۰۱ کے ابتدائی رُبع صفحے پر کتاب کا متن اختتام پذیر ہوتا ہے جس کے فوراً بعد "خاتمۃ الطبع" شروع ہو جاتا ہے جو اگلے صفحے یعنی صفحہ ۱۰۲ کے وسط تک جاری رہتا ہے۔ "خاتمۃ الطبع" کی عبارت ناشر یعنی مولوی محمد یعقوب فرنگی محلی کی تحریر سے ہے۔ اسی صفحے کے نصف آخر میں "صحیح نامہ اغلاط گلزارِ سرور" ہے۔ اسی خاتمے پر میرے پیشِ نظر نسخے کا اختتام ہو جاتا ہے۔ یہ نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور میں محفوظ ہے۔

عام طور پر "گل زارِ سرور" کی اسی ایک اشاعت کے حوالے ملتے ہیں۔ ڈاکٹر نیّر مسعود نے بھی اسی اشاعت کا حوالہ دیا ہے۔[۲۲] مرزا غالب کی تقریظ اسی اشاعتِ اوّل میں شامل ہے۔ ڈاکٹر نیّر مسعود نے اس کا حوالہ دیا ہے جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ان کے پیشِ نظر کتاب کی یہی اشاعتِ اوّل تھی۔ ڈاکٹر گیان چند نے "گل زارِ سرور" کے ذکر میں اس کی کسی اشاعت کا ذکر نہیں کیا۔ ان کی کتابیات میں بھی محض "گلزارِ سرور، مطبوعہ لکھنؤ" درج ہے۔[۲۳] اس سے بظاہر یہی لگتا ہے کہ انھوں نے "گل زارِ سرور" کی کسی نسخے سے براہِ راست استفادہ نہیں کیا بل کہ ثانوی ماخذ یا مآخذ کی مدد سے اس کے بارے میں تفصیلات درج کی ہیں۔ ڈاکٹر سہیل بخاری نے اپنی کتاب میں "گل زارِ سرور" کا ذکر ہی نہیں کیا۔ یوں معلوم ہوا کہ ان تینوں میں سے صرف ڈاکٹر نیّر مسعود نے کتاب سے براہِ راست معلومات اخذ کی ہیں۔ حیرت ہے کہ ڈاکٹر گیان چند نصف صدی سے زائد، تقریباً ۶۰ سال تک اپنی کتاب "اُردو کی نثری داستانیں" میں ترامیم کر کے چھپواتے رہے لیکن اس دوران "گل زارِ سرور" سے براہِ راست استفادہ نہیں کر سکے۔

"گل زارِ سرور" کی دوسری اشاعت کا تذکرہ کہیں نظر سے نہیں گزرا لیکن اس دوسری اشاعت کا ایک نسخہ ہندوستانی اکیڈمی، الہٰ آباد کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ اس نسخے کا برقی عکس معروف برقی کتاب خانے "ریختہ" پر موجود ہے۔[۲۴] یہ اشاعت بھی افضل المطابع نجم العلوم کارنامہ، لکھنؤ سے ہی منظر عام پر آئی۔ اس پر بھی پہلی اشاعت کی طرح سال طباعت و اشاعت درج نہیں۔ سنہ اشاعت کی غیر موجودگی میں اسے دوسری اشاعت سمجھنے کے کچھ قرینے موجود ہیں جن میں سے محض تین یہاں درج کیے جاتے ہیں:

(۱) جیسا کہ اوپر مذکور ہو چکا ہے کہ اشاعتِ اوّل کے سرورق اور "خاتمۃ الطبع" میں سرور کا ذکر زندہ شخص کے طور پر ہوا ہے جب کہ پیشِ نظر اشاعت کے سرورق اور اس اشاعت میں شامل سرور کی دوسری مختصر تحریر "نثر نثرۂ نثّار" کے توضیحی عنوان میں انھیں "مغفور" تحریر کیا گیا ہے۔ گویا یہ اشاعت سرور کی وفات کے بعد منظرِ عام پر آئی۔

(۲) "گُل زارِ سرور" پر مرزا غالب کی جو تقریظ اشاعتِ اوّل میں شامل ہے، وہ اس اشاعت میں شامل نہیں۔

(۳) کتاب کی اشاعتِ اوّل میں "گُل زارِ سرور" کے متن کے بعد صرف "خاتمۃ الطبع" اور غلط نامہ ہے جب کہ دوسری اشاعت میں "گُل زارِ سرور" کے متن اور "خاتمۃ الطبع" کے بعد سرور کی مزید تین مختصر تحریریں بھی شامل ہیں۔ ان میں "نثر نثرۂ نثّار"، قصیدۂ تہنیّتِ جشنِ شادی پرنس آف ویلز ولی عہد ملکۂ برطانیہ اور "قصّۂ شرارِ عشق" شامل ہیں۔

ان اختلافات سے واضح ہو جاتا ہے کہ "گُل زارِ سرور" کے مذکورۂ بالا دونوں نسخے کتاب کی دو الگ الگ اشاعتیں ہیں۔ ان میں سے جس اشاعت کے سرِورق اور "خاتمۃ الطبع" میں سرور کا تذکرہ زندہ شخص کے طور پر ہوا ہے، وہ ظاہر ہے کہ کتاب کی اشاعتِ اوّل ہے اور جس کے سرورق اور دیگر مشمولہ تحریروں میں سرور کو مغفور لکھا گیا ہے، وہ کتاب کی دوسری اشاعت ہے۔

"سرورِ سلطانی" کی طرح "گُل زارِ سرور" بھی تخلیقی ترجمہ ہے۔ اس ترجمے کی نمایاں خصوصیات یہ بیان کی گئی ہیں:

(ا) "گل زارِ سرور" کی نثر اور اُسلوب خاصا رنگین اور مرصّع ہے لیکن اصل کتاب، یعنی "حدائق العشّاق" کے مقابلے میں سادہ ہے۔ ڈاکٹر نیّر مسعود تجزیہ کرتے ہیں:

"حدائق العشّاق" کا اُسلوب بہت رنگین اور لفظی اور معنوی صنعتوں سے گراں بار ہے اور ظہوری کی "سہ نثر" کی یاد دلاتا ہے۔ سرور خود بھی رنگین نثر لکھتے تھے لیکن ملّا رضی کی پیچیدہ اور دقیق عبارت کے سامنے سرور کی بلاغت، فصاحت اور رنگین نگاری -- سلاست معلوم ہونے لگتی ہے۔"(۲۵)

دوسری جگہ وہ مزید تحریر کرتے ہیں:

"دراصل "گُل زارِ سرور" میں سرور کا رویہ "سرورِ سلطانی" کے برعکس ہے۔ "سرورِ سلطانی" میں اُنھوں نے "شمشیر خانی" کی سادہ اور سہل زبان کو نسبتاً مشکل اور رنگین زبان میں منتقل کیا تھا اور "گُل زارِ سرور" میں "حدائق العشّاق" کی رنگین نثر کو مقابلتاً سادہ اور صاف اُردو میں لکھا ہے، لیکن خود "شمشیر خانی" کے رنگین ترجمے سے زیادہ رنگین ہو گیا ہے۔"(۲۶)

(ب) "گل زارِ سرور" کا اُسلوب لکھنؤ اور سرور کے معروف رنگین اور مرصّع اُسلوب کا شاہ کار ہے۔ اوپر وضاحت ہو چکی ہے کہ اصل، یعنی "حدائق العشّاق" کے پُر تصنّع اور رنگین تر اُسلوب کے مقابلے میں "گل زارِ سرور" کی نثر سہل اور سادہ ہے۔ اس کے باوجود سرور کی تصانیف و تالیفات میں "گل زارِ سرور" کی نثر اور اُسلوب سب سے زیادہ رنگین ہے۔ اس سلسلے میں تفصیل میں جانے کے بجائے یہاں محض کتاب پر مرزا غالب کی تقریظ سے ایک اقتباس دینے پر اکتفا کی جاتی ہے:

"مجھ کو دعویٰ تھا کہ اندازِ بیان و شوخیِ تقریر میں "فسانۂ عجائب" بے نظیر ہے۔ جس نے میرے دعویٰ کو اور "فسانۂ عجائب" کی یکتائی کو مٹایا، وہ یہ تحریر ["گل زارِ سرور"] ہے۔"(۲۷)

سرور کی رنگین بیانی کی تفصیل بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر گیان چند نے لکھا ہے کہ "فسانۂ عجائب" کے بعد سرور کے رنگ میں یہی کتاب سب سے اہم ہے اور سرور نے بیان کو طول دے کر تخیّل کی بلندی، استعارے، مبالغے، سجع اور تشبیہ کی مدد سے اُسلوب کو رنگین بنانے کی کوشش کی ہے۔[۲۸]

(ج) سرور کے تراجم میں "گل زارِ سرور" سب سے زیادہ ترجمے کے ذیل میں آتی ہے، یعنی سرور کی کسی کتاب کو کسی حد تک پابند اور آزاد ترجمے کے ملے جلے انداز کا نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے تو وہ یہی کتاب ہے۔ ڈاکٹر نیّر مسعود لکھتے ہیں:

> "سرور کی مترجم تالیفوں میں سب سے زیادہ "گل زارِ سرور" پر ترجمے کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ سرور نے نمایاں طور پر اپنے ترجمے کو اصل کا پابند رکھنے کی کوشش کی ہے۔"[۲۹]

یہاں یہ وضاحت کرنی ضروری ہے کہ سرور نے پابند ترجمہ کرنے کی کوشش اس لیے کی کہ "محرّر اس کا [سرور] بہ ایں وارستگی ارشاد کا پابند تھا۔ صاحبِ فرمایش کو لفظی ترجمہ پسند تھا۔"[۳۰]

(د) سرور کی اپنی طبیعت اور ترجمے کی معاصر ادبی ثقافت؛ فارسی قصّے کے پابند ترجمے کے حق میں نہیں تھی، اس لیے سرور پابند ترجمے کے ساتھ دیر تک نہیں چل سکے اور بار بار اپنے فطری رجحان اور اُسلوب کی طرف لوٹ آتے رہے، چناں چہ انھوں نے "حدائق العشّاق" کا ترجمہ کرتے ہوئے جابجا اپنی مرضی سے ترامیم، اضافوں اور تلخیص سے کام لیا ہے۔ اس وجہ سے اُن کا ترجمہ محض ترجمہ نہیں رہا، بل کہ ماخوذ ترجمے سے آگے بڑھ کر تخلیقی ترجمے میں ڈھل گیا ہے۔ "گل زارِ سرور" کے ناشر اور سرور کے دوست محمد یعقوب انصاری فرنگی محلی کتاب کے "خاتمۃ الطبع" میں لکھتے ہیں کہ "اُس ["گل زارِ سرور"] کے مصنّف نے زورِ طبیعت دکھانے کو ہر ایک جملہ گھڑا ہے؛ اختیاری مقدّمہ تھا، دل خواہ گھٹا بڑھا ہے۔"[۳۱] اسی کو قدرے تفصیل کے ساتھ ڈاکٹر نیّر مسعود نے اپنی کتاب میں بیان کیا ہے۔ اُنھوں نے "گل زارِ سرور" میں اصل متن پر سرور کے جن تصرفّات اور ترامیم کا تفصیل لکھی ہے، وہ یہ ہے:

> "سرور نے جابجا پلاٹ میں اپنی طرف سے تصرّفات کیے ہیں۔ کہیں کچھ حذف کر دیا ہے، کہیں کچھ اضافہ کر دیا ہے، کہیں بیان کو مختصر کر دیا ہے، کہیں طُول دے دیا ہے، کہیں کچھ کرداروں کو خارج کر دیا ہے، کہیں بعض نئے کردار داخل کر دیے ہیں اور کہیں کرداروں کے اوصاف بدل دیے ہیں۔ سرور کے تصرّفات (چند مستثنیات کے ساتھ) مناسبِ محل بھی ہیں اور کتاب کی دل چسپی میں اضافہ کرتے ہیں۔۔۔۔ اُنھوں نے یہ ترجمہ کسی طرح دب کر نہیں

کیا اور یہاں بھی مترجم کی حیثیت سے سرور کی وہ فعالیت رہ رہ کر اُبھرتی ہے جو "شمشیر خانی" کے ترجمے میں بہت نمایاں تھی۔"(۳۲)

ان بیانات سے واضح ہے کہ سرور کے دیگر تراجم کی طرح "گل زارِ سرور" بھی کلیتاً پابند یا آزاد ترجمہ نہیں تھی، بل کہ سرور کے تصرّفات اور مخصوص اُسلوب کے استعمال نے اسے تخلیقی ترجمے کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔

(ہ) سرور نے ترجمے میں انفرادیّت پیدا کرنے کے لیے بعض مقامات پر فارسی اشعار کا ترجمہ اُردو اشعار میں کیا ہے۔ ڈاکٹر منظر اعظمی کے مطابق سرور کے منظوم تراجم اصل کے مقابلے میں بے لُطف اور بے مزہ ہیں۔(۳۳)

ج۔ "شبستانِ سرور":

سرور کا تیسرا اور آخری ترجمہ "شبستانِ سرور" ہے۔ یہ کتاب معروف عالمی سلسلۂ قصص "الف لیلہ و لیلہ" کا اردو میں ترجمہ ہے۔ سرور نے مبینہ طور پر یہ ترجمہ عربی سے کیا۔ اُنھوں نے اس کی تالیف کا کام انتزاعِ سلطنتِ اَوُدھ: جمادی الاول ۱۲۷۲ھ / فروری ۱۸۵۶ء کے بعد شروع کیا۔ اس کے ترجمے کی فرمائش اُن کے بُرے وقتوں کے مربّی منشی شیونرائن بلہوری (سررشتہ دارِ لکھنؤ) نے کی لیکن اُن کے لکھنؤ سے چلے جانے پر یہ سلسلہ رُک گیا۔ بعد ازاں زمانۂ قیامِ بنارس کے دوران ۱۲۷۹ھ / ۱۸۶۳ء میں سرور نے اس کی تالیف مکمل کی۔ اگلے سال اُنھوں نے اس پر نظرِ ثانی کر کے ۲۱ رجب المرجب ۱۲۸۰ھ مطابق یکم جنوری ۱۸۶۴ء کو اس کی اشاعت کا ہبہ نامہ اپنے دوست محمد یعقوب انصاری فرنگی محلی کے نام لکھ دیا۔ اس کے ۲۳ سال بعد ۱۳۰۳ھ / ۱۸۸۶ء میں محمد یعقوب انصاری نے پہلی اور آخری بار یہ کتاب اپنے "مطبع نجم العلوم کارنامہ لکھنؤ" سے شائع کی۔ "شبستانِ سرور" کتاب کا تاریخی نام ہے جس سے کتاب کے سالِ تالیف کا عدد ۱۲۷۹ حاصل ہوتا ہے۔(۳۴)

"شبستانِ سرور" کی تالیف کے سلسلے میں غالباً سب سے اہم معاملہ یہ رہا ہے کہ بقولِ سرور انھوں نے یہ ترجمہ براہِ راست عربی سے کیا یا نہیں۔ خود سرور کا تو ایک مبہم سا بیان یہی ہے کہ انھوں نے "الف لیلہ" کا یہ ترجمہ عربی سے کیا ان کا یہ بیان "خاتمۃ الطبع" کے آخر میں نقل "ہبہ نامہ حق تصنیف "شبستانِ سرور" میں درج ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں:

"عاجز ہیچ مداں، مدرسہ جہل و دانائی کا ابجد خواں؛ بلکہ پڑھا نہ لکھا نام محمد فاضل مشہور، کفش بردارِ اہلِ فضل و کمال مرزا رجب علی معروف سرور نے مجموعۂ لاجواب، دفترِ عالم میں انتخاب، مسمّٰی "الف لیلہ و لیلہ" کا زبان عربی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔"(۳۵)

سرور کے اس دعوے پر سب سے پہلے ڈاکٹر گیان چند نے شک کا اظہار کیا۔ انھوں نے تحریر کیا:

"سرور لکھتے ہیں کہ انھوں نے عربی سے ترجمہ کیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا انھیں ان کہانیوں کا کون سا عربی ایڈیشن دستیاب ہو سکا۔ ممکن ہے انھوں نے عبدالکریم کی "الف لیلہ" پر تکیہ کیا ہو۔"(۳۶)

دوسری جگہ انھوں نے لکھا:

"خفیف اختلاف کے سوا "شبستانِ سرور" میں وہی حکایات ہیں جو عبدالکریم کی "الف لیلہ" میں ہیں سرور نے اپنے عربی ماخذ کی صراحت نہیں کی۔"(۳۷)

ڈاکٹر گیان چند کے اس بیان پر ڈاکٹر حنیف نقوی نے یہ گرفت کی ہے کہ ڈاکٹر گیان چند کو اپنے شک کی رہبری میں "شبستانِ سرور" کے ماخذ پر مزید تحقیق کرنی چاہیے تھی، خاص طور پر اس صورت میں کہ وہ عبدالکریم کی "الف لیلہ" سے اس کی مماثلت کا ذکر کر چکے تھے، لہٰذا انھیں دونوں کا موازنہ کرنا چاہیے تھا۔(۳۸)

ڈاکٹر گیان چند کے بعد ڈاکٹر نیّر مسعود نے اس موضوع پر دادِ تحقیق دی اور مثالوں کے ذریعے یہ ثابت کرنے میں کام یاب رہے کہ سرور نے "الف لیلہ" کا ترجمہ عربی سے کیا نہ کسی اَور زبان سے، بل کہ انھوں نے اپنے ہم عصر منشی عبدالکریم کی "الف لیلہ" (مطبوعہ) سے "شبستانِ سرور" کا چراغ جلایا ہے۔(۳۹)

آخر میں ڈاکٹر حنیف احمد نقوی نے تحقیق کے اس سلسلے کو آگے بڑھایا۔ اپنے ایک مفصّل مقالے میں انھوں نے ڈاکٹر نیّر مسعود کی پیش کردہ مثالوں کی توضیح کرنے کے ساتھ ساتھ موازنے اور مقابلے کے بعد یہ بھی ثابت کیا ہے کہ سرور نے عربی سے براہِ راست ترجمہ کرنے کے بجائے عبدالکریم کے ترجمۂ "الف لیلہ" کو بنیاد بنا کر اپنا ترجمہ تشکیل دیا۔(۴۰) عبدالکریم نے "الف لیلہ" کا اُردو ترجمہ انگریزی سے کیا۔ وہ انگریزی میں خاصی مہارت رکھتے تھے۔ ڈاکٹر حنیف نقوی نے تحقیق کے بعد یہ سراغ بھی لگایا ہے کہ عبدالکریم نے یہ ترجمہ غالباً فارسٹر کے انگریزی ترجمے سے کیا اور یہ کہ عبدالکریم کا اردو ترجمہ پہلی بار ۱۲۶۳ھ /۱۸۴۷ء میں شائع ہوا تھا۔(۴۱)

"شبستانِ سرور" کی اشاعت کے سلسلے میں دوسرا اہم پہلو اس کی اشاعت میں تاخیر کا ہے۔ اوپر تفصیل بیان ہو چکی ہے کہ سرور نے یہ کتاب ۱۲۷۹ھ مطابق ۱۸۶۳ء میں تیار کر لی تھی اور اگلے سال ۱۲۸۰ھ مطابق

جنوری ۱۸۶۴ء میں اس کا ہبہ نامہ بھی اپنے ناشر دوست محمد یعقوب انصاری فرنگی محلی کا نام لکھ دیا تھا۔ اس کے باوجود کتاب اس کے ۲۳ سال بعد شوال المکرم ۱۳۰۳ھ مطابق جولائی ۱۸۸۶ء میں طبع و شائع ہوئی۔ (۴۲) سوال پیدا ہوتا ہے کہ ناشر کے نام حقوق منتقل ہونے کے باوجود کتاب کی اشاعت میں ۲۳ سال کی تاخیر کیوں ہوئی؟ ڈاکٹر حنیف نقوی نے اس کی توجیہ یہ بیان کی ہے کہ سرور نے "شبستانِ سرور" کی تکمیل و نظر ثانی کے بعد اس کی اشاعت خود موخّر رکھنے کا ارادہ کیا ہو گا، کیوں کہ وہ نہیں چاہتے ہوں گے کہ عبد الکریم "شبستانِ سرور" کو دیکھ کر یہ بھانپ جائیں کہ سرور نے ان کی نقل کی ہے یا یہ کہ سرور نے اُن کے ترجمے سے سرقہ کر کے اور اُن کا نام لیے بغیر اپنا ترجمہ تشکیل دیا ہے۔ (۴۳)

میرا خیال ہے کہ "شبستانِ سرور" کی اشاعت میں تاخیر کی وجہ سرور نہیں بلکہ ناشر ہو سکتے ہیں۔ جہاں تک سرور کے باعث ہونے کا تعلق ہے تو ہمیں معلوم ہے کہ سرور نے نظر ثانی کرنے کے فوراً بعد ۱۲۸۰ ہجری مطابق ۱۸۶۴ عیسوی میں ہبہ نامہ لکھ کر حقوق ناشر کو منتقل کر دیے تھے۔ اگر انھیں کتاب کی اشاعت میں تاخیر منظور ہوتی تو وہ ہبہ نامہ اتنی جلدی لکھ کر ناشر کو حقوق منتقل نہ کرتے بلکہ نظر ثانی کرنے کے یا کسی اور بہانے سے مزید کچھ عرصے کے لیے کتاب کا مسودہ اپنے پاس رکھ سکتے تھے۔ اس کے مقابلے میں ناشر کے پاس کتاب کو تاخیر سے چھاپنے کی ٹھوس وجہ موجود تھی۔ اس کی تفصیل ملاحظہ کیجیے۔

اوپر تحریر ہو چکا ہے کہ عبد الکریم کی "الف لیلہ" پہلے پہل ۱۲۶۳ ہجری مطابق ۱۸۴۷ عیسوی میں شائع ہوئی۔ ڈاکٹر حنیف نقوی نے اس کی مزید دو اشاعتوں کا ذکر کیا ہے جو ۱۲۷۷ ہجری مطابق ۱۸۶۰ عیسوی اور ۱۲۹۵ ہجری مطابق ۱۸۷۸ عیسوی میں اسی مطبعے یعنی مطبعِ مصطفائی سے منظرِ عام پر آئیں۔ (۴۴) اس کتاب کی اس کے بعد کی ایک اشاعت ۱۳۰۰ ہجری مطابق ۱۸۸۳ عیسوی کے شواہد بھی ملتے ہیں۔ (۴۵) عبد الکریم کی "الف لیلہ" کی ان اشاعتوں کی تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۶۳ء کے ۱۴ سال بعد جو اشاعت ہوئی اس وقت تک "شبستانِ سرور" ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی۔ ۱۲۷۷ء کے دو یا تین سال بعد "شبستانِ سرور" مکمل ہو چکی تھی۔ اس وقت ابھی عبد الکریم کی "الف لیلہ" بازار میں موجود تھی اور "شبستانِ سرور" کی اشاعت کی صورت میں دونوں کے درمیان مماثلت واضح ہو کر سامنے آتی جس کی وجہ سے سرور کی شہرت کو تو خیر کیا نقصان پہنچتا کہ وہ "فسانۂ عجائب"، "سرور سلطانی" اور "گل زار سرور" کے ذریعے اپنے اسلوب، ادبی شخصیت اور شہرت کو مستحکم کر چکے تھے) لیکن ناشر کے شہرت اور تجارت، دونوں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔

اس کے بعد سرور ۱۲۸۶ھ میں غالب کی وفات کے دوماہ بعد ذی الحجہ ۱۲۸۶ھ مطابق مارچ اپریل ۱۸۶۹ء میں وفات پا جاتے ہیں۔[۴۶] "الف لیلہ" از عبد الکریم کی معلومہ تین اشاعتوں میں سے دوسری اشاعت کے آٹھ نو سال بعد سرور کی وفات ہو گئی، جب کہ سرؔور کی وفات کے نو سال بعد عبد الکریم کی "الف لیلہ" کی تیسری اشاعت منظرِ عام پر آئی۔ ممکن ہے ۱۲۷۸ھ اور ۱۲۹۵ھ کے دوران بھی عبد الکریم کی "الف لیلہ" کی اَور کوئی ایک یا زیادہ اشاعتیں منظرِ عام پر آئی ہوں جن تک میری رسائی نہ ہو سکی لیکن اس کا امکان کم ہے۔ بہر حال، اندازہ ہے کہ سرور کی وفات ۱۲۸۶ ہجری کے وقت عبد الکریم کی "الف لیلہ" کی دوسری اشاعت کو منظر عام پر آئے نو (۹) سال کا عرصہ گزر چکا تھا، لہٰذا اس کا پورا امکان موجود ہے کہ تب تک عبد الکریم کی "الف لیلہ" بازار میں دست یاب نہیں ہو گی، چناں چہ مندرجہ بالا تناظر میں یہ "شبستانِ سرؔور" کو شائع کرنے کا اچھا موقع تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ سرؔور کی وفات یا کسی اور وجہ سے ان کے دوست اور ناشر محمد یعقوب انصاری نے خود ہی کتاب کو شائع کرنا مناسب نہیں سمجھا، تا آں کہ ۱۲۹۵ھ میں عبد الکریم کی "الف لیلہ" کی تیسری اور ۱۳۰۰ ہجری میں چوتھی اشاعت منظرِ عام پر آ گئی۔

اس کے تین سال بعد ناشر نے "شبستانِ سرؔور" شائع کی۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہو گی کہ ایک تو عبد الکریم کی "الف لیلہ" بازار میں موجود نہیں ہو گی اور دوسرے یہ کہ اب سرور کی وفات کو کم و بیش ۱۷ سال گزر چکے تھے، لہٰذا اب اگر "شبستانِ سرؔور" شائع ہوتی تو نہ تو سرور کی شہرت کو کوئی نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا اور نہ عبد الکریم کی "الف لیلہ" سے اس کا موازنہ کیے جانے کا زیادہ امکان تھا۔ اس کا اندازہ یوں بھی ہوتا ہے کہ تب سے آج تک کسی نے بھی "شبستانِ سرؔور" اور عبد الکریم کی "الف لیلہ" کا موازنہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس سے بدیہی طور پر یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ "شبستانِ سرؔور" کی تالیف کے وقت یہ اندیشہ موجود تھا یا کچھ ایسے اصحاب موجود تھے جو یہ موازنہ کر سکتے تھے جس کی صورت میں مصنف اور ناشر کو قانونی یا اخلاقی طور پر نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا، چناں چہ ناشر نے جان بوجھ کر "شبستانِ سرؔور" کی اشاعت موخر کیے رکھی۔

"شبستانِ سرور" سرور کی آخری تالیف ہے۔ اس کا اُسلوب سادہ اور آسان ہے۔ ڈاکٹر گیان چند کے مطابق "سرور کی تمام تصانیف [کذا] میں غالباً "شبستانِ سرور" کی زبان سب سے زیادہ سہل ہے۔"[۴۷] ایسا ہونا فطری ہے، کیوں کہ "شبستانِ سرور" ۔۔۔۔ سرور کی آخری عمر کا شاہ کار ہے۔ بڑھاپے میں اُن کے قوا بھی مُضمحل ہو چکے تھے۔ انتزاعِ سلطنتِ اَوَدھ کے بعد سے اُن کی طبیعت بے زار رہنے لگی تھی اور ذہنی اُپج میں بھی اُس طرح کی خیزش نہیں رہی تھی۔

بحیثیت مجموعی سرور کے یہ تین تراجم اُنّیسویں صدی میں مشرقی زبانوں سے ایک مشرقی زبان میں ترجمے کی روایت کا حصّہ ہیں۔ ان تراجم میں قدیم دور کے ترجمے کی ثقافت اور معیار پوری طرح موجود ہے۔ فارسی سے عام طور پر جو افسانوی تراجم اردو میں ہوئے ہیں، ان میں لفظی ترجمے کی بجائے ماخوذ ترجمے اور تخلیقی ترجمے کو ترجیح دی جاتی تھی۔ اس زمانے کے معروف اور غیر معروف مترجمین کے پیش نظر ترجمے کا معیاری اسلوب اور معیار یہی تھا۔ موجودہ دور میں ترجمے کے جو اصول وضع ہوئے ہیں، وہ عام طور پر مغرب سے درآمد شدہ ہیں جب کہ اُنّیسویں صدی بل کہ بیسویں صدی کے نصف اول تک مشرقی زبانوں سے جو ترجمے اردو میں ہوتے رہے ہیں، ان کے اپنے اصول ترجمہ کاری تھے جن کا ترجمہ کاری کے جدید مغربی اصولوں سے کوئی موازنہ اور مقابلہ ہو ہی نہیں سکتا۔

جہاں تک اردو میں قدیم افسانوی تراجم کا تعلق ہے تو اس حوالے سے ترجمہ کاری کی تہذیب اور اصول پہلے بیان ہو چکے ہیں۔ سرور کے تراجم ان اصولوں پر پورے اُترتے ہیں، لیکن ایک حوالے سے سرور کے یہ تراجم زیادہ اہم گردانے جاسکتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ سرور ایک صاحبِ طرز نثر نگار تھے۔ ان کے دور میں لفظی ترجمہ مقبول نہ ہونے کی وجہ سے ترجمہ نگار کے پاس یہ اختیار موجود تھا کہ وہ ترجمہ کرتے ہوئے اپنے انفرادی اسلوب اور انداز کی مدد سے ترجمے کو تالیف میں بدل دے۔ سرور نے اس آزادی کا بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔ تراجم میں ان کی پہلی دو کتابیں: "سرورِ سلطانی" اور "گل زارِ سرور" ہی کسی حد تک ترجمے کے معیار پر پوری اترتی نظر آتی ہیں جب کہ تیسری کتاب "شبستانِ سرور" کے بارے میں اب یہ واضح ہو چکا ہے کہ وہ ترجمہ نہیں بل کہ تالیف ہے۔ چونکہ اس کا متن ایک قدیم مشرقی زبان کی کتاب کے ترجمے سے تشکیل دیا گیا، اس لیے اسے بھی ترجمے ہی میں شمار کیا جاتا ہے۔

حواشی و تعلیقات اور مآخذ:

۱۔ اس فہرست کی تیاری میں ڈاکٹر گیان چند جین کی مایۂ ناز کتاب "اردو کی نثری داستانیں" (کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، اشاعت سوم، ۲۰۱۴ء) (مجموعی اشاعت چہارم) سے مدد لی گئی ہے۔

۲۔ سید سلیمان حسین: 'مقدمہ'، صفحہ ۱۳، بر "نو آئین ہندی"، از مہر چند کھتری مہر، مرتبۂ سید سلیمان حسین (لکھنؤ، اترپردیش اردو اکادمی، پہلا ایڈیشن، ۱۹۸۸ء)۔

۳۔ دیکھیے حاشیہ ۱۔

۴۔ رفاقت علی شاہد: "قصۂ نورتن جہاں"؛ اٹھارہویں صدی کی نادر داستان" (تحقیقی مقالہ)، (۱) ماہ نامہ "قومی زبان"، انجمن ترقیِ اردو پاکستان، کراچی، جلد ۶۸، شمارہ ۷: جولائی ۱۹۹۶ء؛ (۲) ہفتہ وار "ہماری زبان"، (نئی دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی، ۲۲ اگست، یکم ستمبر ۱۹۹۶ء)

۵۔ امیر حسن نورانی: "اُردو کی غیر مطبوعہ نثری داستانیں"، مشمولہ "اُردو نثر کے سرچشمے"، دہلی، مکتبۂ صبحِ اَدب، ۱۹۸۳ء، صفحات ۳۶ تا ۵۴۔

۶۔ ان کی تفصیل ڈاکٹر سہیل بخاری کے ڈاکٹریٹ کے مطبوعہ مقالے "اردو داستان (تحقیقی و تنقیدی مطالعہ)"، (اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، اشاعت اول، مارچ ۱۹۸۷ء) کے صفحات ۳۴۰ تا ۳۸۷ میں دیکھی جاسکتی ہے۔

۷۔ دیکھیے حاشیہ ۱۔

۸۔ گیان چند، ڈاکٹر: "اردو کی نثری داستانیں"، (کراچی، انجمن ترقیِ اردو پاکستان، اشاعتِ سوم، ۲۰۱۴ء)، (مجموعی اشاعت چہارم)، صفحات ۶۳۸ تا ۶۴۲۔

۹۔ سرور، مرزا رجب علی بیگ (مترجم): "سرور سلطانی"، (لکھنؤ، مطبع سلطانی، سنہ ندارد) دیباچۂ مولف، صفحات ۳، ۵، ۶۔

۱۰۔ ایضاً، صفحہ ۳۰۰۔

۱۱۔ ایضاً، صفحہ ۶۔

۱۲۔ نیر مسعود، ڈاکٹر: "رجب علی بیگ سرور - حیات اور کارنامے"، (الہ آباد، ۱۹۶۷ء) صفحات ۲۶۳، ۲۶۶ تا ۲۷۴۔

۱۳۔ ایضاً، صفحہ ۲۷۶، ۲۷۷۔

۱۴۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر: "اردو داستان (تحقیقی و تنقیدی مطالعہ)"، صفحہ ۲۲۰۔

۱۵۔ شائع کردہ مجلسِ ترقیِ ادب (لاہور، اشاعت اول، ۱۹۷۳ء)

۱۶۔ حنیف نقوی، ڈاکٹر: "مرزا رجب علی بیگ سرور اور بنارس"، مشمولہ "رجب علی بیگ سرور؛ چند تحقیقی مباحث"، (نئی دہلی، انجمنِ ترقیّ اُردو (ہند)، اشاعتِ اوّل، ۱۹۹۱ء) صفحہ ۲۷۔

۱۷۔ گیان چند، ڈاکٹر: "اُردو کی نثری داستانیں"، صفحہ ۵۲۴۔

۱۸۔ نیر مسعود، ڈاکٹر: "رجب علی بیگ سرور-حیات اور کارنامے"، صفحات ۲۷۷، ۲۷۸۔

۱۹۔ سرور، مرزا رجب علی بیگ (مترجم): "گل زارِ سرور" (لکھنؤ، مطبع افضل المطابع، سنہ ندارد) صفحہ ۸۔

۲۰۔ ایضاً۔

۲۱۔ حنیف نقوی، ڈاکٹر: "مرزا رجب علی بیگ سرور اور بنارس"، صفحہ ۲۷۔

۲۲۔ نیر مسعود، ڈاکٹر: "رجب علی بیگ سرور-حیات اور کارنامے"، صفحات ۲۷۷، ۲۷۹، ۲۸۸، ۲۹۰۔

۲۳۔ گیان چند، ڈاکٹر: "اُردو کی نثری داستانیں"، صفحہ ۸۱۵۔

۲۴۔ https://www.rekhta.org/ebooks/detail/gulzar-e-suroor-mirza-rajab-ali-beg-ebooks

۲۵۔ نیر مسعود، ڈاکٹر: "رجب علی بیگ سرور-حیات اور کارنامے"، صفحہ ۲۸۲۔

۲۶۔ ایضاً، صفحہ ۲۸۳، ۲۸۴۔

۲۷۔ سرور، مرزا رجب علی بیگ (مترجم): "گل زارِ سرور"، اندرونِ سرورق کا صفحہ۔

۲۸۔ گیان چند، ڈاکٹر: "اُردو کی نثری داستانیں"، صفحہ ۵۲۵۔

۲۹۔ نیر مسعود، ڈاکٹر: "رجب علی بیگ سرور-حیات اور کارنامے"، صفحہ ۲۸۴۔

۳۰۔ سرور، مرزا رجب علی بیگ (مترجم): "گل زارِ سرور"، خاتمۃ الطبع، از ناشر (مولوی محمد یعقوب انصاری)، صفحہ ۱۰۱۔

۳۱۔ ایضاً۔

۳۲۔ نیر مسعود، ڈاکٹر: "رجب علی بیگ سرور-حیات اور کارنامے"، صفحہ ۲۸۴۔

۳۳۔ منظر اعظمی، ڈاکٹر: "اُردو میں تمثیل نگاری"، (نئی دہلی، انجمنِ ترقیّ اُردو (ہند) اُردو گھر، اشاعتِ اوّل، ۱۹۷۷ء) صفحہ ۳۰۱۔

۳۴۔ (۱) حنیف نقوی، ڈاکٹر: "شبستانِ سرور کا ماخذ"، سہ ماہی "صحیفہ"، لاہور، مجلس ترقّی ادب، شمارہ ۱۸۷: اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۶ء، صفحہ ۱۳؛ (۲) گیان چند، ڈاکٹر: "اُردو کی نثری داستانیں"، صفحہ ۵۲۶؛ (۳) نیر مسعود، ڈاکٹر: "رجب علی بیگ سرور - حیات اور کارنامے"، صفحہ ۲۹۱۔

۳۵۔ سرور، مرزا رجب علی بیگ (مولف): "شبستانِ سرور"، (لکھنؤ، "مطبع نجم العلوم کارنامہ، واحد اشاعت، ۱۳۰۳ھ / ۱۸۸۶ء) صفحہ ۱۵۲۔

۳۶۔ گیان چند، ڈاکٹر: "اُردو کی نثری داستانیں"، صفحہ ۵۷۴۔

۳۷۔ ایضاً، صفحہ ۵۲۷۔

۳۸۔ حنیف نقوی، ڈاکٹر: "شبستانِ سرور کا ماخذ"، صفحہ ۹۔

۳۹۔ اس تفصیل کے لیے اُن کے ڈاکٹریٹ کے مقالۂ مطبوعہ "رجب علی بیگ سرور - حیات اور کارنامے" کے صفحات ۲۹۴ تا ۲۹۶ ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔

۴۰۔ مطبوعہ سہ ماہی "صحیفہ"، لاہور، مجلسِ ترقّی ادب (شمارہ ۱۸۷: اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۶ء) صفحات ۷ تا ۱۴۔

۴۱۔ ایضاً، صفحہ ۸۔

۴۲۔ خاتمۃ الطبع "شبستانِ سرور"، صفحہ ۱۵۰۔

۴۳۔ حنیف نقوی، ڈاکٹر: "شبستانِ سرور کا ماخذ"، صفحہ ۱۳، ۱۴۔

۴۴۔ ایضاً، صفحہ ۸۔

۴۵۔ مخزونہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور۔

۴۶۔ حنیف نقوی، ڈاکٹر: "مرزا رجب علی بیگ سرور اور بنارس"، صفحہ ۲۷۔

۴۷۔ گیان چند، ڈاکٹر: "اُردو کی نثری داستانیں"، صفحہ ۵۲۶۔